امجد علی

اسکالر، پی ایچ ڈی اردو، جامعہ پشاور، پشاور

پروفیسر ڈاکٹر سلمان علی

استاد شعبہ اُردو، جامعہ پشاور، پشاور

صفیہ بشیر گنڈہ پور کے افسانوں میں خواتین کے سماجی اور معاشی مسائل کی عکاسی

Amjad Ali

Scholar, Ph.D Department of Urdu, Peshwar University, Peshwar.

Prof. Dr. Suleman Ali

Professor, Department of Urdu, Peshwar University, Peshwar.

Reflection of Socioeconomic and Problems of Women in Bashir Gandapur's Shorts Stories Safia

Prof. Dr. Safia Bashir Gandapur is basically an economist. She is also interested in Urdu literature and wrote many short stories. " Zarghona" is a collection of her short stories. These short stories are mainly related to the social and economic problems of women. This article is intended to present an account of how successfully she has highlighted these problems which are faced by the women of our society .As the women of this locale are facing these problem yet, therefore this writer, her book and this socioeconomic study of these short stories get more significance in present scenario.

Key words: *Economist, Urdu Literature, Short Stories, Society, Socioeconomic, Significance.*

پروفیسر ڈاکٹر صفیہ بشیر کا اصل میدان معاشیات ہے۔ وہ ڈیرہ اسماعیل خان میں پیدا ہوئیں۔ اُن کا تعلیمی ریکارڈ انتہائی شاندار رہا۔ میٹرک میں صوبہ بھر کی لڑکیوں میں پہلی پوزیشن حاصل کی اور انھیں نیشنل ٹیلنٹ سکالرشپ ملا۔ اپنے تعلیمی سفر کے دوران پہلے ایف اے میں پشاور بورڈ اور بعد میں گریجویشن میں یونیورسٹی بھر میں اوّل آنے پر گولڈ میڈل یونیورسٹی

سے طلائی تمغہ حاصل کیا۔ پشاور یونیورسٹی سے ایم اے معاشیات اور پنجاب یونیورسٹی سے ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا۔ تدریس کا آغاز ۱۹۸۰ء میں گومل یونیورسٹی کے شعبہ پبلک ایڈمنسٹریشن میں لیکچرار کی حیثیت سے کیااور بعد ازاں اسی یونیورسٹی میں بطور چیئرپرسن بھی اپنی خدمات انجام دیتی رہیں۔

اُن کی علم وادب سے دلچسپی کا ثبوت اُن کا خوبصورت افسانوی مجموعہ " زرغونہ " ہے۔ اس مجموعے میں چودہ افسانے شامل ہیں۔ ان افسانوں میں مختلف سماجی اور معاشی مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ صفیہ بشیر ادب برائے زندگی کی قائل ہیں۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں سے آنکھیں چُرانا اُن کے مزاج کے خلاف ہے اس لیے وہ کہانی محض تفریح کے لیے نہیں بنتی بلکہ اس کے ذریعے گردوپیش کا وہ منظر نامہ پیش کرتی ہے جس میں سماج کی سچی تصویر اپنی تمام تر خوبصورتی اور بدصورتی کے ساتھ نمایاں ہو جاتی ہے۔ اصلاحی رجحان کی وجہ سے وہ افسانے کو اپنے پیغام کی اشاعت کا وسیلہ بناتی ہے۔ ان افسانوں کے مرکزی کردار نسوانی ہیں اور زیادہ تر مسائل کا تعلق براہ راست عورت کی زندگی سے ہے۔ اس مطالعے میں فنی اعتبار سے ان افسانوں کے معیار کو جانچنے کی بجائے عورت کے مختلف مسائل کی عکاسی کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔

"ماں" اس مجموعے کا پہلا افسانہ ہے۔ مامتا ایک آفاقی جذبہ ہے۔ اپنے بچوں کے کامیاب کل کے لیے مائیں اپنا آرام، سکون، جوانی غرض سب کچھ داؤ پر لگاتی ہیں۔ بچوں کی تربیت اور تعلیم کی جسمانی اور ذہنی صعوبتیں سہتی ہیں۔ لیکن جب یہ بچے بڑے ہو کر کمانے لگتے اور کامیاب بن جاتے ہیں تو اپنی ماؤں کی ان قربانیوں کو شاذ ہی یاد رکھتے ہیں۔ ماؤں کے ساتھ ناانصافی اور بدسلوکی کی مثالیں مہذب اور ترقی یافتہ ممالک میں بھی ملتی ہیں۔ اس افسانے میں مسز میکوئن کے ساتھ بھی اس طرح ہوتا ہے۔ وہ اپنے شوہر کی وفات کے بعد اپنے بیٹے کی تعلیم اور تربیت میں کوئی کسر نہیں چھوڑتی۔ اس کا بیٹا بڑا ہو کر انجنیئر بنتا ہے اور کویت میں اپنی بیوی کے ساتھ مستقل سکونت اختیار کرتا ہے۔ مسز میکوئن اس کی شکل دیکھنے کو ترستی ہے۔ عورت کی اس حرماں نصیبی کے بارے میں اس افسانے میں صفیہ لکھتی ہیں: ۔

> " کبھی کبھی مجھے ندامت بھری ہنسی بھی آتی کہ مشرق اور مغرب ایک دوسرے کے بارے میں کیسی دیومالائی قسم کی سوچ رکھتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی تو خاصی نفسانفسی آگئی ہے۔ ماں باپ اور اولاد ایک ہی چھت کے نیچے رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کو سمجھ نہیں پاتے۔۔۔۔ پھر جب مغرب میں جہاں بظاہر عورت کو بہت بڑا مقام دیا جاتا ہے میں سر عام عورتوں کو روتے ہوئے اور شکائتیں کرکے دیکھتی تو حیران رہ جاتی کہ خوشی شاید مکمل طور پر ایک ذاتی احساس ہے اور کہیں پہ ہی کسی کسی کو نصیب ہو سکتی ہے۔ "(۱)

مغربی معاشرہ مادیت پرستی کی دوڑ میں اتنا بے سمت ہو چکا ہے کہ اس معاشرے کے لوگوں کے فطری جذبات بھی لائف سٹائل کو بہتر بنانے اور پرتعیش زندگی گزارنے کے چکر میں دب گئے ہیں۔ ایک طرف اس معاشرے میں مسز میکوئین جیسی مظلوم اور دکھی مائیں ہیں تو دوسری طرف شارلین جیسی خودغرض اور خودپرست مائیں بھی ملتی ہیں۔ شارلین اپنی بیٹی "ٹیمی" کو افسانے کی راوی کے ہاں چالاکی اور عیاری سے چھوڑتی ہے۔ خود جاکر خواب آور گولیاں کھاتی ہے اور

اپارٹمنٹ کا دروازہ اندر سے بند کرتی ہے۔ اس کی سنگ دلی اور بے رحمی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جب پولیس اس کے گھر پر چھاپا مارتی ہے، تو ٹیمی اپنی اصل ماں (شارلین) کے پاس جانے سے انکار کرتی ہے کیونکہ وہ اُسے پیٹتی اور ہر وقت ڈانٹتی رہتی ہے۔ شارلین حکومت کی طرف سے ملنے والا ویلفیر الاؤنس مہینے کے ابتدائی دنوں میں خرچ کرتی ہے۔ بچی کی تربیت اور گھر داری پر توجہ دینا وہ اپنی ذمہ داری نہیں سمجھتی۔ مادیت پرستی نے اُسے خود غرضی میں مبتلا کر دیا ہے۔ وہ اپنے عیش و آرام کے لیے اپنی بیٹی سے جان چھڑانا چاہتی ہے۔

" یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں آیا کہ وہ ماں تو اس سے بس پیچھا چھڑانا چاہتی ہے۔ اس نے بڑے اطمینان سے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولا اور یہ کہتی ہوئی لفٹ میں گھس گئی۔ کہ " آپ بہت اچھی اور محبت کرنے والی ماں ہیں۔ آپ کے پاس میری بچی رہ بھی جائے تو بڑی خوش رہے گی۔ میں تو بس اب تھک گئی ہوں۔ کچھ آرام کروں گی۔ اسے مجھ سے اور مجھے اس سے کوئی محبت، کوئی لگاؤ تو ہے نہیں بلکہ اس نے تو مجھے بیمار کر دیا ہے "(۲)

اس افسانے میں مشرق اور مغرب میں ماں کے سماجی مقام کا موازنہ کیا گیا ہے۔ مشرقی معاشرے میں باوجود کٹھن زندگی کے ماں کو ایک مقدس اور پر وقار مقام حاصل ہے۔ مادیت پرستی نے اگرچہ بظاہر زندگی کو پر آسائش بنا دیا ہے لیکن روحانی برکات اور رشتوں کے تقدس جیسی نعمتوں سے انسان کو محروم کر دیا ہے۔

افسانہ "سسٹم" میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ عملی زندگی ایک خود کار سسٹم ہے۔ احساسات اور جذبات رکھنے والے لوگ اس سسٹم میں مس فٹ ہوتے ہیں۔ وہ یا تو ہمیشہ مضطرب اور دُکھی رہتے ہیں اور یا پھر اس بے رحم سسٹم کے کل پرزے بن جاتے ہیں۔ یہ افسانہ ایک حساس میڈیکل سٹوڈنٹ رخسانہ کی کہانی ہے۔ وہ ہر مریض کے درد کو محسوس کرتی ہے۔ لوگوں کی پریشانیوں کو لے کر کئی کئی دنوں تک افسردہ رہتی ہے۔ ہسپتال میں سنیئر ڈاکٹروں کی ناانصافی اور رشوت لے کر غلط رپورٹ تیار کرنے جیسے جرائم کو دیکھ کر وہ ڈپریشن کا شکار ہو جاتی ہے۔ بہت عرصے بعد راوی کی ملاقات ڈاکٹر رخسانہ سے گاؤں کے ہسپتال میں ہوتی ہے۔ ہر وقت سوچوں میں گم رہنے والی ڈاکٹر رخسانہ پُر اعتماد اور سنجیدہ نظر آتی ہے۔ شادی کے بعد اپنے گھر کو سنبھالنے اور شوہر کو خوش رکھنے کے لیے وہ تندہی سے کام کرتی ہے۔ وہ بس پیسے کمانے کی مشین بن گئی ہے۔ وہ مریضوں سے بھاری فیس بھی لیتی ہے۔ گویا سسٹم نے اُس کو اپنے مزاج کے مطابق ڈھال لیا ہے۔ اس بے رحم معاشرے میں زندگی گزارنے کا فن اُس کو آ گیا ہے۔

اس افسانے میں رخسانہ کا کردار سماجی ظلم کا شکار نمائندہ کردار ہے۔ وہ اپنے گھر کو بچانے کے لیے شوہر کی ناز برداری کرتے کرتے اپنے تشخص سے محروم ہو جاتی ہے۔

" ہاں دوست یہ کریڈٹ تو میرے شوہر کو جاتا ہے۔
اس نے مجھے زندگی کا صحیح مفہوم بتا دیا۔ جینا سکھایا۔ اعتماد دیا۔ خود سروس چھوڑ کے آرام سے بیٹھ گیا۔ مگر مجھے تو اس نے پیسہ بنانے کی مشین بنا دیا۔ جب میرے سر پر گھر کے سارے اخراجات

،بچوں کی ساری ذمہ داری آگئی تو میں شاعری اور موسم تک بھول گئی۔ یہ دنیا یہاں کے لوگ، یہ سارا سسٹم ہے ہی اتنا بے رحم کہ انسان کو پتھر کا بنا ہی دیتا ہے۔ میں چونکہ ہر حال میں گھر کو بچانا چاہتی تھی۔ اس لیے حالات کے مطابق ڈھل گئی۔"(۳)

"غلام لمحے" میں ہمارے معاشرے کے دوہرے معیار کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ہم جدید فیشن کے دلدادہ ہیں۔ ٹی وی اور ڈش انٹینا گھروں میں آگئے ہیں لیکن خواتین کو اپنی جائز ضروریات کے لیے باہر جانے کی اجازت نہیں۔ اس افسانے کا مرکزی کردار "وہ" شہر کے مہنگے انگریزی ماڈل سکول میں پڑھتی ہے لیکن اپنے لباس اور برقع کی وجہ سے اپنی ماڈرن سہیلیوں کے طنز کا نشانہ بنتی ہے۔ گھر والوں کی طرف سے سخت پابندیوں اور بات بات پر ڈانٹ ڈپٹ سے وہ گھٹ گھٹ کر جی رہی ہے۔

"گھر سے اسے روزانہ لیکچر ملتا۔ سکول پڑھانے اور آزادی دینے کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ تم ہاتھ سے نکل جاؤ۔ تمہارے لیے فیصلے ہم کریں گے اور تمہیں ماننا پڑے گا۔ بغاوت کی گنجائش ہمارے نظام میں نہیں مل سکتی۔ اس سب کچھ کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ڈری، سہمی اور خوفزدہ رہنے لگی۔"(۴)

سکول میں بھی وہ چپ چپ رہتی ہے۔ کسی سرگرمی میں حصہ نہیں لیتی۔ کلاس میں جواب جاننے کے باوجود ٹیچر کے سوال کا جواب نہیں دے پاتی۔ گھر کے اس محبوس ماحول کی وجہ سے اُس کے مزاج میں بغاوت کے عناصر پنپنے لگتے ہیں۔ شادی کے بعد وہ اپنی بیٹی نازش کی تربیت اپنے اصولوں پر کرتی ہے۔ اپنی بیٹی کے لیے وہ ایک شفیق ماں کے علاوہ مہربان دوست بھی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ نازش اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزارے۔ اپنے فیصلے خود کرے۔ اُس کو اپنی زندگی کے فیصلوں کے لیے دوسروں کے سامنے سر نہ جھکانا پڑے۔ بیس سال تک بغیر کسی روک ٹوک، کسی اعتراض اور بغیر کسی تحدید کے زندگی گزارتے گزارتے نازش عصری تقاضوں سے ہم آہنگ آزاد خیال لڑکی بن جاتی ہے۔ اور ایک دن جب اپنی عملی زندگی کے بارے اپنا فیصلہ سناتی کہ وہ ماڈلنگ کے شعبے میں جارہی ہے تو ماں کے قدموں تلے سے زمین سرک جاتی ہے۔" وہ" یہ سوچ کر خود کو طفل تسلیاں دیتی ہے کہ جو بھی ہے نازش خوش ہے اور اپنی مرضی سے اپنی زندگی جی رہی ہے۔ لیکن جب وہ نازش کی ڈائری پڑھتی ہے تو اُسے احساس ہو جاتا ہے کہ اُس کی دی ہوئی حد درجہ آزادی کی وجہ سے نازش کے مستقبل کے لیے اُس کے دیکھے ہوئے سپنے ٹوٹ گئے ہیں تو نازش زندگی سے آنکھیں ملانے کی جراءت نہیں کر پاتی۔

"میری امی تو اپنی دانست میں میرا بھلا چاہتی تھیں۔ قوت فیصلہ کی جس آزادی سے وہ خود محروم تھیں مجھے انہوں نے پوری پوری عطا کی۔ لیکن کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ کس کی قسمت میں کیا لکھا ہوتا ہے۔ میں جس کو بہت چاہتی تھی۔ اس نے صرف یہ کہہ کر مجھے ٹھکرا دیا ہے کہ میں بہت آزاد خیال لڑکی ہوں۔ اور اسے مشرق کی پروقار اور حدود میں رہنے والی لڑکیاں پسند ہیں۔ کاش ممی آپ نے اپنے خوابوں کی لیبارٹری میں مجھ پر اتنا بھیانک تجربہ نہ کیا ہوتا۔" (۵)

اعتدال کے رستے سے ہٹ کر معاشرہ حقیقی خوشی سے ہمکنار نہیں ہو سکتا۔اس افسانے میں ہمارے معاشرے کے دوہرے معیاروں کی وجہ سے پیدا ہونے والے سماجی مسائل کی عکاسی کی گئی ہے۔

افسانہ "رشتوں کا بھرم" میں معاشرتی تضادات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ہمارے معاشرے میں اکثر شادی کے نام پر محض سمجھوتے ہوتے ہیں۔اکثر و بیشتر اختلافات کے باوجود صرف لوگوں کو دکھانے کے لیے اس بندھن کو قائم رکھا جاتا ہے اور اس کو قائم رکھنے میں بھی زیادہ تر قربانی عورت ک ہی دینی پڑتی ہے۔"رشتوں کا بھرم" معاشرتی رویوں سے نالاں ایک ستائی ہوئی عورت کی حرماں نصیبی کی کہانی ہے۔باپ کے گھر والدین،بہن اور بھائیوں کی بات بات پر لعن طعن سے بیزار "وہ" ایک سہانے مستقبل کا خواب دیکھتی ہے جہاں اس کا اپنا گھر اور اپنی مرضی ہو۔شادی کے بعد اُسے ایسا لگتا ہے کہ محرومی جیسے اس کی مٹی میں گوندھی گئی ہے اس لیے اس کے لیے اپنے گھر کو بچانا زندگی کا مقصد بن جاتا ہے۔وہ سوچتی ہے کہ:

> "کیا عورت سے وابستہ ہر رشتہ قربانی ہی چاہتا ہے۔کیا خراج دیتے دیتے عمر گزرتی ہے۔اور یہ جو مسکراہٹیں ہوتی ہیں سب مصنوعی ہوتی ہیں۔ایسے ہی کتنے سوال اس کی روح پہ گھاؤ ڈالتے رہتے۔"(۶)

اپنے بڑھاپے کے بارے میں وہ صرف یہ تصور کر سکتی ہے کہ بچوں کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد وہ خود اپنے اپنے گھروں میں بیوی بچوں کے ساتھ خوش ہوں گے اور وہ اپنے بوڑھے شوہر کے ساتھ آبائی گھر میں کھانستے کھانستے کبھی لڑتے کبھی صلح کرتے موت کا انتظار کرتی ہو گی۔

"سمجھوتہ" میں مرد کی مثالیت پسند طبیعت کو اجاگر کیا گیا ہے۔مرد خود جیسا بھی ہو عورت اُسے پاکباز اور حسین تر چاہیئے ہوتی ہے۔شادی سے پہلے آسمان سے تارے توڑنے تک کے وعدے کرتا ہے۔لیکن عورت کو ہمیشہ مردوں کے بدل جانے کا کھٹکا لگا رہتا ہے۔اس افسانے میں راحیل لبنیٰ سے ٹوٹ کر پیار کرتا ہے۔ہمیشہ ساتھ نبھانے کی قسمیں کھاتا ہے۔جب لبنیٰ راحیل سے پوچھتی ہے:

> "کیا تم مجھے نامکمل وجود کے ساتھ۔۔۔۔۔؟لبنیٰ میں تمہارا ہوں۔زندگی کی آخری سانسوں تک،محبت جسم سے نہیں روح سے کی جاتی ہے۔۔۔۔۔"(۷)

جب ایک ٹریفک حادثے میں لبنیٰ دونوں ٹانگوں سے محروم ہو جاتی ہے تو راحیل راستے بدل لیتا ہے۔کیونکہ وہ ایک زندہ لاش کے لیے اپنے سارے خواب قربان نہیں کر سکتا۔اس کے برعکس اگر شوہر معذور ہو جاتا ہے تو بیوی سے تا دمِ مرگ ساتھ نبھانے کی توقع کی جاتی ہے اور عام طور پر وہ وفا کا پیکر ثابت ہوتی بھی ہے۔ایسی کئی مثالیں ہم اپنے گرد و پیش سے دے سکتے ہیں جہاں شوہر کی لاعلاج بیماری یا جسمانی معذوری کی صورت میں عورت نہ صرف وفادار بیوی ثابت ہوتی ہے بلکہ وہ اپنے شوہر کی ذمہ داریاں بھی نبھاتی ہے۔

اس افسانے میں لبنیٰ جب مایوس ہو جاتی ہے تو معذور بچوں کے سکول کو جوائن کر کے اپنے دکھوں کا مداوا کر لیتی ہے۔اس طرح وہ اپنی زندگی کا کوئی جواز اور مقصد تلاش کر لیتی ہے۔گویا دکھوں سے سمجھوتہ کر لیتی ہے۔

"ساعتوں کے دُکھ "غربت کی وجہ سے ایک غریب لڑکی کے خوابوں کے ٹوٹنے کی کہانی ہے۔ سلمٰی کی ملاقات راوی سے گاؤں میں اپنے کلینک میں ہوتی ہے۔ سلمٰی ایک پر عزم اور ہونہار لڑکی ہے جو پڑھ کر ڈاکٹر بننا چاہتی ہے۔اُس کا جذبہ راوی کو بہت متاثر کرتا ہے۔ راوی کسی مجبوری کی وجہ سے کراچی جاتا ہے اور وہاں ملازمت اختیار کرتا ہے۔ایک دن مریضوں میں وہ جانی پہچانی شکل دیکھتا ہے۔وہ سلمٰی ہوتی ہے۔استفسار پر راوی کو معلوم ہوجاتا ہے کہ باپ کے مرجانے کے بعد گھر کی ساری ذمہ داری اُس پر آن پڑی ہے۔اس لیے اُس نے کراچی آکر ایک آفس کو جوائن کیا ہے۔تاکہ گھر اور بہن کی تعلیم کے اخراجات پوری کرسکے۔

> "یہاں میرے دور کے رشتہ دار تھے۔اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔کچھ دن اُن کے ساتھ رہی۔پھر ملازمت کرلی۔آخر کب تک کسی پر بوجھ بنی رہتی۔۔۔۔اپنی خاطر اپنی معصوم بہن کی خاطر مجھے زندگی کے تقاضے پورے کرنے پڑے۔۔۔۔آپ نے گاؤں چھوڑ دیا تھا تو میں سوچتی تھی کہ آپ کی کمی پوری کروں گی۔لیکن میرے خواب پورے نہ ہوسکے۔۔۔نہ ہوسکے۔۔۔۔پھر وہ سسکنے لگی۔"(۸)

راوی جو سلمٰی کے لیے محبت کے جذبات رکھتا ہے اُس کا معائنہ کرتا ہے اور اپنی ہمت افزا باتوں سے اُس کو حوصلہ دیتا ہے۔لیکن جب اُس کی لاش اس کے سامنے لائی جاتی ہے تو وہ احساس جرم میں مبتلا ہوجاتا ہے کیونکہ اس نے اُس لڑکی کے دل میں آگے بڑھنے کی امید تو جگائی تھی لیکن عملی طور پر اُس کے لیے کچھ نہ کیا۔

"باس" میں ارم کے کردار کے ذریعے ملازمت کرنے والی عورتوں کے روزمرہ کے مسائل کی نشاندہی کی گئی ہے۔ملازمت کرنے والی عورتوں کو ہراساں کرنے کا معاملہ بہت عام ہوتا جارہا ہے۔دفتروں میں ان خواتین کو طرح طرح کے نامناسب کلمات سننے کو ملتے ہیں۔ مرد گھور کر ان کو دیکھتے ہیں جس کی وجہ سے خواتین کھل کر اپنا کام نہیں کرپاتیں۔ دفتروں کے علاوہ دیگر پبلک مقامات مثلاً راستہ، بس سٹاف اور گاڑیوں میں بھی عورتوں کو تاڑنا مردوں کا پسندیدہ مشغلہ بن گیا ہے۔ان حرکات کی وجہ سے کام کرنے والی خواتین یہ ذلّت مجبوراً برداشت کرتی ہیں یا کام چھوڑ جاتی ہیں۔

> "نیا باس اُسے بڑے طریقے اور پلاننگ کے ساتھ تنگ کرنے لگا۔اس کے ٹھیک ٹھاک کام پر بے جا تنقید کرتا۔نئی نئی غلطیاں نکالتا۔اُس کے دفتر آنے اور جانے کے اوقات پر نظر رکھتا۔مگر جس چیز سے مس ارم کو چڑ تھی وہ اُس کی طنزیہ مسکراہٹ اور گھور کے دیکھنے کا مخصوص انداز تھا۔دفتر میں داخل ہوتے ہی سر سے پاؤں تک یوں گھور کر دیکھتا۔کہ اُسے پسینہ آنے لگتا۔پھر سلام کا جواب ایسی پر اسرار طنزیہ مسکراہٹ سے دیتا جس کے درپردہ نجانے کیا عزائم تھے۔مگر مس ارم کانپ اٹھتی اس کا دل چاہتا فوراً ہی اُس شخص کے آگے سے ہٹ جائے۔اور دوبارہ کبھی بھی اُس کے سامنے نہ آئے۔"(۹)

مردوں کے اس ہتک آمیز رویّے کی وجہ سے مشرقی خواتین نہ صرف اعتماد کے ساتھ معاشی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لے پاتیں بلکہ باصلاحیت خواتین کی ایک کثیر تعداد آگے آنے سے کتراتی ہیں جس کا منفی اثر ملکی ترقی کی رفتار پر پڑتا ہے۔

افسانہ " پروفیسر " میں عورت کے مجروح جذبات کی عکاسی کی گئی ہے۔ایک عورت کی زندگی زیادہ تر اتفاقات کے سہارے آگے بڑھتی ہے۔ اگر والدین اور بہن بھائی محبت کرنے والے ہوں، تو شادی سے پہلے کی زندگی میں ایک لڑکی من مانی کر سکتی ہے۔ اپنی سہیلیوں کی صحبتوں سے محظوظ ہو سکتی ہے۔ باپ کے گھر ایک طرح سے اُس کی زندگی بے فکری کی ہوتی ہے۔ شادی کے بعد وہ میاں کے پسند وناپسند کی پابند ہو جاتی ہے۔ اُس کے بنائے ہوئے اصولوں کے مطابق زندگی گزارتی ہے۔ہوشیار اور حساس لڑکیاں اپنے گردوپیش میں یہ سب کچھ دیکھتی ہیں تو انہیں اپنی اوقات کا اندازہ ہو جاتا ہے۔اس افسانے میں " سارا" زندگی سے بھرپور ایک شوخ اور چنچل لڑکی ہے۔اس کی منگنی بچپن میں اپنے کزن سے ہو گئی ہے۔وہ شادی سے پہلے کی زندگی کو بھرپور انداز میں گزارنا چاہتی ہے۔

> " دیکھو ماریا ڈیئر پڑھنا تو ہم نے بس وقت گزاری کے لیے ہی ہے۔ اور یہی آخری دو سال بس میرے ہیں۔ اس کے بعد تمہیں پتہ ہے۔ میرا کزن باہر سے نازل ہونے والا ہے۔ باقی زندگی تو اس کی تابعداری میں گزرے گی۔ ہاں بس یہی دو سال۔۔۔۔۔ صرف چوبیس مہینے اور صرف اور صرف ۷۳۰ دن بلکہ ۷۳۱ دن کیونکہ یہ لیپ کا سال ہے۔
>
> سارا تم تو ایسے حساب لگا رہی ہو۔ جیسے اس کے بعد تو تم نے بس فوت ہی ہو جانا ہے۔ "(۱۰)

سارا یونیورسٹی کی ایک سرگرم طالبہ ہے۔ ہر قسم کی تقریبات میں پیش پیش ہے۔ کزن کے بیرون ملک سیٹل ہونے کی خبر اُس کے ہوش اڑا دیتی ہے۔ وہ زندگی کی رنگینیوں سے بے زار ہو جاتی ہے۔ اپنی بے وقعتی اور ٹھکرائے جانے کا احساس اُس کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ اُس کی زندگی اچانک بے سمت ہو جاتی ہے۔

> " سارا تو تقریباً اپنے حواس کھو بیٹھی۔ یہ تو اُس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ بچپن کا منگیتر اسے یوں دھوکہ دے گا۔ اس کے تو سارے راستے سارے خواب بچپن سے ہی ایک سمت میں متعین ہو چکے تھے۔ زندگی کی پلاننگ کب سے ہو چکی تھی۔ اب وہ کیسے جیے گی۔ کونسی منزل کی طرف جائے گی۔ وہ جو ہر وقت اُس کے تصور میں رہتا تھا۔ کیسے اُسے اپنے ذہن سے نکالے گی۔ ساری ساری رات وہ کوریڈور میں ٹہل ٹہل کے گزار دیتی۔ جیسی وہ بالکل بے وقعت ہو چکی ہے۔ جیسے اس کا کوئی سکوپ نہ رہا ہو۔ "(۱۱)

ماریہ کی پُرخلوص دوستی، نصیحتوں اور پروفیسر (گھوسٹ) کی زندگی سے متاثر ہو کر سارا مقابلے کے امتحان میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ کزن کے ٹھکرائے جانے کو وہ زندگی کا روگ نہیں بناتی بلکہ مثبت رہتی ہے۔ اور مجرد رہتے ہوئے بھی ایک کامیاب اور مقبول پروفیسر بن جاتی ہے۔

"فطرت کے آنسو" میں بتایا گیا ہے کہ ہم اسلام (دین فطرت) کے پیروکار ہوتے ہوئے بھی معاشرے میں ذات پات کی تقسیم اوراعلیٰ وادنیٰ کے امتیازات روا رکھتے ہیں۔ تعلیم یافتہ اور مذہبی گھرانوں میں بھی خاندان سے باہر شادی کرنے کو معیوب خیال کیا جاتا ہے۔ بچوں کا رشتہ طے کرتے وقت انسان کی شرافت اور لیاقت کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ انسان زندگی کو اپنے خود ساختہ معیاروں کے مطابق کرنے میں کبھی کبھی فطرت سے متصادم ہو جاتا ہے۔ اس افسانے میں سیما ایک سلجھی ہوئی، سلیقہ شعار اور پاکباز لڑکی ہے۔ جو اپنے والدین کے اعتماد کا پاس رکھنے کی خاطر یونیوسٹی میں بہت محتاط رہتی ہے۔ اپنے کلاس فیلو شاہ رخ کے لیے اپنی محبت کو بھی وہ ایک مقدس جذبہ سمجھتی ہے۔ شاہ رخ کی بولتی نگاہوں کو وہ محسوس کرتی ہے لیکن بہت ریزرو رہتی ہے۔ تعلیم کا دور ختم ہونے کے بعد وہ گھر داری، شاپنگ اور سیر و تفریح میں مشغول ہو جاتی ہے۔ سیما کو یقین ہوتا ہے کہ شاہ رخ اسے پروپوز کرے گا تو ماں باپ اُس کی پسند کا احترام کریں گے۔ لیکن ماں یہ جانتے ہوئے بھی کہ سیما شاہ رخ کو پسند کرتی ہے اس لیے صاف انکار کر دیتی ہے کہ اُس کا تعلق دوسری برادری سے ہے۔ ہمیشہ والدین کی مرضی پر چلنے والی سیما والدین کے اس فیصلے پر شدید ردعمل ظاہر کرتی ہے۔ لیکن اس کا فائدہ نہیں ہوتا۔

> " یہ پہلا موقع تھا جب سیما نے والدین سے بحث کی۔ ضد کی۔ لڑائی کی۔ بات چیت بند کی۔ مگر اس کے پیار کرنے والے ماں باپ پتھر کے چٹان بن گئے۔ وہ ضد کرتی رہی شور مچاتی رہی۔ منتیں کرتی رہی۔ دلائل دیتی رہی۔ اپنی طرف سے ہر ممکن حربہ آزما لیا مگر وہ ناں کو ہاں میں بدل نہ سکی۔"(۱۲)

سیما اس فیصلے سے بہت پریشان ہو جاتی ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ اس کی زندگی کا مقصد ہی ختم ہو گیا ہے۔ لیکن پھر یہ سوچ کر کہ رشتے تو آسمانوں میں بنتے ہیں۔ خدا کے سامنے ذات پات کی کوئی اہمیت نہیں۔ وہ اپنا مقدمہ خدا کے دربار میں پیش کرتی ہے اور مذہب میں پناہ ڈھونڈتی ہے۔ وہ گیان دھیان میں اتنی مستغرق ہو جاتی ہے کہ اپنی دعا بھول جاتی ہے۔ وہ دنیاوی علائق سے بے زار ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ جب والدین شاہ رخ کے رشتے کے لیے مان جاتے ہیں تب تک وہ اس مدعا سے دستبردار ہو چکی ہوتی ہے۔

> " الحمد اللہ" مجھے میری نئی دنیا بہت راس آگئی ہے۔
> ظالم، بے حس روایات اور قومیت کے جھوٹے غرور سے عاری یہ دنیا مجھے بہت عزیز ہے۔
> کون کہتا ہے مجھے کچھ نہیں ملا۔
> مجھے تو وہ ملا ہے جو کسی کسی کو ملتا ہے۔ ہر ایک کو نہیں۔ اس کے چہرے پہ سرما کی چاندنی کا سا سکون چھایا ہوا تھا۔
> "لیکن"
> فطرت اپنی پوری سچائی کے ساتھ رو رہی تھی۔"(۱۳)

افسانہ "زرغونہ" میں مغرب میں خاندان کے بکھرتے ہوئے شیرازے کے مقابلے میں مشرق میں موجود خاندانی وحدت کی برکات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مغرب میں نفسا نفسی کی وجہ سے اعلیٰ انسانی اقدار معدوم ہو چکی ہیں۔ خونی رشتوں کی کشش کمزور پڑ گئی ہے۔ شادی نبھانے کو ضروری خیال نہیں کیا جاتا۔ اس وجہ سے پورا معاشرہ باوجود مادی آسائشوں کے عدم اطمینان کا شکار ہے۔ اس کے مقابلے میں مشرق میں مقابلتاً صورت حال بہتر ہے۔

" اپنے کلچر کی یہی بات تو ہمارے لیے قابل فخر ہونی چاہئے کہ لوگ مشکلات کے باوجود شادی نبھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس حقیقت کو تو مغربی ممالک بھی مانتے ہیں کہ مشرق میں شادیاں زیادہ پائیدار ہوتی ہیں۔ اور بچوں کو ماں کا تحفظ ملتا ہے۔ بے شک ہمارے ہاں عورت اپنے حقوق کو چھوڑ دیتی ہے مگر اپنے بچوں کی زندگی میں ٹوٹے ہوئے گھروں اور علٰحیدگی کا زہر نہیں گھولتی۔ ہم لوگ معاشی طور پر پسماندہ ہی سہی مگر کچھ باتیں اب بھی ہمارے ہاں ایسی ہیں کہ ہم مغرب کے لیے ایک رول ماڈل ہو سکتے ہیں۔"(۱۴)

اخلاقی انحطاط نے انسان کو اس حد تک گرا دیا ہے کہ انسان کا انسان پر سے اعتبار اُٹھ گیا ہے۔ خود غرضی کی لعنت نے انسانوں میں دوریاں اور نفرتیں پیدا کی ہے۔ اپنی دوسرا تھ کے لیے جانوروں سے دوستی قائم کرنا انسان کی اس آدم بیزاری کی روشن دلیل ہے۔

"وہ عورت اولڈ ہوم میں تو تنہا نہیں رہتی تھی۔ مگر اپنے اپارٹمنٹ میں بالکل تنہا تھی۔ اس دنیا میں اس کا واحد ساتھی T.B نامی وہی چھوٹا سا کتا تھا۔ جو بقول اس کے بہت ہی سمجھدار اور تربیت یافتہ تھا۔ اور اس کے ساتھ ہر کام میں مدد کرتا تھا۔

اس کے وہ الفاظ میرے لیے ہمیشہ ناقابل فراموش رہیں گے۔ "مادام یہ کتے!! یہ کتے انسانوں سے بدرجہا بہتر ہیں۔ یہ انسانوں کی طرح مطلبی، خود غرض اور بے وفا نہیں ہیں۔ یہ وفادار اور جان نثار ہوتے ہیں۔ یہ آپ کو کبھی بھی اکیلا نہیں چھوڑتے۔ ہمیشہ آپ کا ساتھ دیتے ہیں۔"(۱۵)

افسانہ "غم روزگار" میں انسان کو درپیش معاشی مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ غم روزگار ایک ایسی حقیقت ہے جس کے سامنے لطیف جذبات محض خواب ثابت ہوتے ہیں۔ احتیاجات زندگی کو پوری کرتے کرتے انسان کا ذہنی سکون ختم ہو جاتا ہے۔ معاشی ناآسودگی سے پیدا ہونے والے مسائل انسانی زندگی کی تمام مسرتوں کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ اس افسانے میں نغمانہ اور جاوید ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ خاندان کی مرضی کے خلاف دونوں شادی کرتے ہیں۔ جاوید نغمانہ کو الگ گھر لے کے دیتا ہے لیکن مناسب روزگار نہ ملنے کی وجہ سے جاوید اپنی بیوی اور گھر سے بیزار ہو جاتا ہے۔ اس کو اپنی بیوی کی ہر بات میں خامیاں ہی خامیاں نظر آتی ہیں۔ تین بچوں کی پرورش اور دیگر گھریلو اخراجات کا بوجھ اُٹھانا جاوید کے لیے ناقابل برداشت بن جاتا ہے۔ جاوید گھر سے باہر دلچسپیاں ڈھونڈنے لگتا ہے۔ کئی کئی دن گھر سے غائب رہتا ہے۔ ان کی

پر کیف زندگی دونوں کے لیے جہنم بن جاتی ہے۔ نغمانہ کے لیے اپنے تین بچے پیروں کی زنجیریں بن گئے ہیں۔ کبھی خودکُشی کے منصوبے بناتی ہے۔ اور کبھی گھر سے بھاگنے کے ارادے باندھتی ہے لیکن کچھ نہیں کر پاتی۔ خط کے ذریعے جب اس کی پروفیسر اُس کی راہنمائی کرتی ہے تو اُن کی خوشیاں لوٹ آتی ہیں۔

" تمہاری اور جاوید کی انڈر سٹینڈنگ آج بھی برقرار رہ سکتی ہے۔ اور تم دونوں ایک خوشگوار ازدواجی زندگی گزار سکتے ہو۔ بشرطیکہ تم کوئی اور بچہ پیدا نہ کرو۔ اور اپنے چھوٹے سے کنبے کی اکنامکس کو اچھی طرح سیٹ کرو۔ کوئی مناسب روزگار ڈھونڈو۔ یا پھر کوئی چھوٹا سا کاروبار شروع کرو۔ اگر پیسے نہ ہوں تو حکومت کی کسی قرضہ سکیم سے مدد لو۔ خوب دل جمعی سے کام کرو۔ تمہارا مسئلہ صرف اور صرف معاشی مسئلہ ہے۔ جاوید بھی تمہاری طرح نوعمر اور اپنے ماں باپ کا لاڈلا بیٹا تھا۔ وہ بھی ان مسائل کا سامنا نہیں کرتا ہوگا۔ اور ردعمل کے طور پر تم سے الجھتا ہوگا۔ اسے بھی ہمدردی اور سکون کی ضرورت ہے۔ وہ تمہارا شوہر ہے اسے اس کی کمزوریوں سمیت قبول کرو۔ بچوں کی پرورش اچھی طرح سے کرو اور کم پیسوں میں گزارا کرنا سیکھو۔"(۱۶)

نغمانہ جب اس مشورے پر عمل کرتی اور معاشی استحکام حاصل کرتی ہے تو رفتہ رفتہ سارے معاملات ٹھیک ہوتے جاتے ہیں۔ پروفیسر صفیہ بشیر گنڈاپور نے معاشیات میں پشاور یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی ہے۔ اُس نے پی ایچ ڈی تھیسس کے لیے بھی غربت جیسے اہم اور ہمہ گیر موضوع کو منتخب کیا۔ اس لیے زندگی کے معاشی پہلو کا احاطہ اُنہوں نے بڑی کامیابی سے کیا ہے۔

''بھول بھلیاں'' میں خواتین کے ازدواجی تحفظ کے مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ عورت جہاں بھی ہو مسائل اور محرومیاں سایے کی طرح اُن کے آس پاس ہوتے ہیں۔ اس افسانے میں ترقی یافتہ ممالک کی خواتین کے ایک اہم مسئلے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ازدواجی تحفظ حاصل کرنے کی خاطر وہ غیر ملکی باشندوں سے شادی کرتی ہیں۔ غیر ملکی لوگ جن میں ایشائی مردوں کی بھی کثیر تعداد شامل ہوتی ہے شہریت کے حصول کے لیے وقتی طور پر اُن کا ساتھ دیتے ہیں۔ بینک بیلنس کا مطلوبہ ہدف حاصل کرنے کے بعد یہ لوگ یا تو اپنے ممالک میں واپس چلے آتے ہیں۔ یا پھر وہاں پر پرزے نکالتے ہیں اور ان عورتوں سے بے وفائی کرتے ہیں۔ پریٹی، کیتھی اور این کے کردار ایسی عورتوں کی مثالیں ہیں۔ پریٹی کا بنگلہ دیشی شوہر اُسے یہ بتا کر چلا ہے کہ ماں باپ مذہبی روایات کے مطابق اس کی شادی کر رہے ہیں۔ کیتھی کے ایک بچے نٹاشا کا باپ جمیکا کا تھا۔ اور میتھیو کا باپ ایرانی تھا۔ کیتھی کا منصوبہ یہ ہے کہ جب یہ دونوں بچے سکول جانے لگیں گے تو گھر کے اخراجات چلانے کے لیے وہ اس دفعہ ایشیائی مرد سے بچہ پیدا کرے گی۔ اس افسانے میں ایک کردار سونیا گل کا بھی ہے۔ اُس کی کہانی بھی کم و بیش ایسی ہی ہے۔

" کافی عرصہ پہلے پاکستان سے میٹرک کرنے کے بعد وہ سپانسر شپ پہ کنیڈا آئی تھی۔ اور عرصے سے ٹورنٹو میں مقیم تھی۔ اپنی فیملی سمیت اُسے امیگریشن مل گئی۔ جب اُسے ایک ریڈی

میڈ گارمنٹس بنانے والی فیکٹری میں مستقل جاب مل گئی تو اُس کے ماں باپ کو اُس کی شادی کا خیال آیا۔ ظاہر ہے ان کی نظر سب سے پہلے کراچی والے رشتہ داروں پر پڑی۔ دور پار کا ایک رشتہ دار لڑکا پسند آیا۔ منگنی ٹیلی فون پر ہوئی۔ شادی کے لیے سب پاکستان گئے۔ سونیا کا شوہر شروع میں ٹھیک ٹھاک رہا۔ مگر یہاں کی آزادی اور پیسہ دیکھ کر پر پرزے نکالنے شروع کیے۔ اور آخر میں بالکل روپ بدل لیا۔ وہی بیوی جس کی وجہ سے اسے کنیڈا کی شہریت ملی۔ اسے دو معصوم بچیوں کے ساتھ طلاق دے دی۔"(۱۷)

مادی آسائشوں کے حصول کے پیچھے انسان مرتبہ انسانیت سے گر گیا ہے۔ مشرق کے باسی یہ سمجھتے ہیں کہ اہل مغرب مطمئن زندگی گزار رہے ہیں۔ اس لیے وہ خود کو یورپین طرز زندگی کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نام نہاد ترقی یافتہ اقوام میں بھی انسانی زندگی اور خصوصاً عورت کی زندگی مصائب اور محرومیوں سے بھری ہے۔

افسانوی مجموعہ "زرغونہ" ایک ایسا آئینہ ہے جس میں خواتین کی زندگی کے مختلف جہات پر روشنی پڑتی ہے۔ باپ کے گھر، درسگاہ، ملازمت کی جگہ اور سسرال میں خواتین کو جن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے اِن افسانوں میں اِس کی خوبصورت عکاسی کی گئی ہے۔ افسانے کے محدود کینوس پر مصنفہ نے بڑی فنکاری سے مشرق و مغرب میں عورت کی زندگی کے کئی رنگ دکھائے ہیں۔ نامناسب سماجی رویّوں کی وجہ سے خواتین کی جذباتی شکست وریخت اور نفسیاتی الجھنوں کی پیش کش بھی بہت جاندار ہے۔ معاشی عدم استحکام کی وجہ سے زندگی پر پڑنے والے اثرات پر اُن کی گہری نظر ہے کیونکہ اس موضوع پر اُنہوں نے قابل قدر اور اطلاقی نوعیت کا تحقیقی کام بھی کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صفیہ بشیر محض معاشی مسائل کی نشاندہی نہیں کرتی بلکہ اُن کا حل بھی بتاتی ہیں۔ اُن کے افسانوں کے انجام میں واضح خطیبانہ انداز اِن کے فنی معیار کو متاثر کرتا ہے لیکن موضوع کی اہمیت، زبان کی شستگی اور صفائی قاری کی دلچسپی کو برقرار رکھتی ہے۔ خواتین کی زندگی کے مختلف سماجی اور معاشی مسائل کی برجستہ عکاسی پر افسانوی مجموعہ "زرغونہ" کو خیبر پختون خوا کے افسانوی ادب میں قابل قدر اضافہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ صفیہ بشیر گنڈہ پور، ماں، مشمولہ "زرغونہ" پبلیشر ندارد، ۱۹۹۹ء، ص:۲

۲۔ ایضاً، ص:۳۔۴

۳۔ سسٹم، مشمولہ زرغونہ، ص:۱۰

۴۔ غلام لمحے، زرغونہ"، ص:۱۷

۵۔ ایضاً، ص:۱۹

۶۔ رشتوں کا بھرم مشمولہ زرغونہ، ص:۲۵

۷۔ سمجھوتہ، مشمولہ زرغونہ، ص:۲۸

۸۔ ساعتوں کے دکھ، مشمولہ زرغونہ، ص:۳۶

۹۔ باس، مشمولہ زرغونہ، ص:۳۹

۱۰۔ پروفیسر، مشمولہ زرغونہ:ص:۴۴

۱۱۔ ایضاً، ص:۴۹

۱۲۔ فطرت کے آنسو، مشمولہ زرغونہ، ص:۵۴

۱۳۔ ایضاً، ص:۵۷

۱۴۔ زرغونہ، مشمولہ زرغونہ، ص:۶۱

۱۵۔ ایضاً، ص:۶۲

۱۶۔ غم روزگار، مشمولہ زرغونہ، ص:۷۰

۱۷۔ بھول بھلیاں، مشمولہ زرغونہ، ص:۸۳۔۸۴